(غلام گردش)

نکولس، باوقار طریقے سے مصائب کو جھیلتا رہا!

نکولس دوم روس کا آخری شہنشاہ یعنی زار تھا۔تئیس برس بلاشرکت غیرت حکومت کرتا رہا۔اسکا انجام کیا ہوا اور اپنی موت کو کس وقار سے قبول کیا، کچھ دیر بعد عرض کرتا ہوں۔نکولس کا والد یعنی بادشاہ فوت ہوا تو وہ صرف چھبیس برس کا تھا۔زار کی تدفین کی شاہی تقریب جاری تھی۔نکولس دوم نے اپنے ایک قریب ترین دوست کا بلا کر کہا، کہ ابھی وہ زار بننے کے لائق نہیں ہے۔اسکی مکمل طور پر تربیت نہیں ہوئی۔دوست نے جواب دیا،نکولس، آپکو خدا نے بادشاہت کیلئے منتخب کیا ہے۔یہ فیصلہ کسی انسان کا نہیں ہے۔اس خدائی فیصلہ سے مفر ممکن نہیں۔روس کا شاہی خاندان راسخ العقیدہ مسیحی تھا۔نکولس نے زار بننا قبول کرلیا۔اگلے تئیس برس، روس کی بدقسمتی کا وہ دور تھا، جس میں اسکی بحریہ اور افواج کو ہر مقام پر شکست فاش ہوئی۔جاپان نے روس کے بیالیس بحری جہازوں کو صرف آدھے گھنٹے میں برباد کر کے رکھ دیا۔روس کے مقامی لوگوں کے حالات حد درجہ مخدوش ہو گئے۔لوگ اپنے حقوق کیلئے آواز اُٹھانے لگے مگر زار کے سپاہیوں نے بے دریغ قتلِ عام کر کے ہر آواز کو خاموش کرنے کی بھرپور کوشش کی جو وقتی طور پر تو کامیاب رہی۔مگر طویل دورانیہ میں ظلم اور جبر کی حکومتی پالیسی مکمل طور پر ناکام ہوگئی۔نکولس کو یقین تھا کہ انسانی حقوق اور جمہوریت بیکار قسم کے نعرے ہیں۔ایک مرتبہ، کسی سیانے درباری نے مشورہ دیا کہ اسے جمہوری حکومت بنا دینی چاہیے کیونکہ زمانہ بدل چکا ہے۔نکولس کا جواب تھا،''حکومت کرنے کا واحد طریقہ، مضبوط اور طاقتور بادشاہت ہے۔جمہوریت میں صرف بحث ومباحثہ ہوتا ہے۔لوگوں کے مسائل حل کرنے کی استطاعت جمہوری نظام میں موجود نہیں ہوتی''۔درباری خاموش ہوگیا۔نکولس اپنے خیالات میں مکمل طور پر غلط ثابت ہوا۔عرض کرنے کا مقصد صرف یہ ہے کہ نکولس ایک شہنشاہ تھا اور وہ آخری دم تک شہنشاہ کے طور پر زندہ رہا۔

1917 کے انقلاب کے بعد،نکولس دوم، اہلیہ، بیٹا اور چار بیٹیوں کو کیمونسٹ حکومت نے Ekaterinburg کے ایک خصوصی گھر میں قید کر دیا۔اسے شاہی لباس پہننے کی اجازت نہیں تھی۔مگر عام لباس پہننے کے باوجود، وہ ہرگز عام آدمی نظر نہیں آتا تھا۔کھانے کیلئے پورے خاندان کو سادہ گوشت کے ٹکڑے دیے جاتے تھے۔جسے وہ میز پر بیٹھ کر اس طرح کھاتے تھے کہ کوئی شاہی کھانا ہو۔جو سپاہی قید خانے میں ڈیوٹی پر ہوتے تھے، وہ اس خاندان کا باوقار رویہ دیکھ کر گھبرا جاتے تھے۔پورے شاہی خاندان کو اپنے انجام کی بابت اندازہ تھا، مگر انہوں نے کبھی کسی قسم کی شکایت نہیں کی۔آسٹریا اور لندن کے شاہی خاندان، نکولس دوم کے قریب ترین عزیز تھے، مگر آخری زار نے کبھی بھی انکو یہ نہیں کہا کہ اسکی جان بخشی کروادی جائے۔یورپ کے اعلیٰ ترین خاندانوں سے منسلک ہونے کے باوجود زار نے یہ درخواست نہیں کی کہ اسے جلاوطن کر دیا جائے۔وہ کبھی بھی روسی سیاست میں حصہ نہیں لیگا۔حیران کن بات یہ بھی ہے کہ اس نے روسی کیمونسٹ حکومت کو ایک خط تک نہیں لکھا کہ اسے اور اسکے خاندان کو بنیادی مراعات تک حاصل نہیں ہیں۔زار نے روس کی کسی عدالت میں رحم کی اپیل دائر نہیں کی۔اس نے پولٹ بیورو کو کسی قسم کا معافی نامہ نہیں بھجوایا۔سولہ اور سترہ جولائی 1918 کی درمیانی شب، جیلر نے خاندان کو بتایا کہ انہیں سیکیورٹی کی وجہ سے کسی اور جگہ منتقل کیا جا رہا ہے۔نکولس کا بیٹا معذور تھا۔رات کو ڈیڑھ بجے زار نے اپنے بیٹے کو گود میں

اُٹھایا۔ بیوی بچوں کو ساتھ لیا اور جیلر کے حکم پر گھر کے تہہ خانے میں آ گیا۔ وہاں پہنچ کر سپاہیوں کو کہا کہ دو کرسیاں لے کر آؤ۔ ایک کرسی پر زار نے اپنی بیوی کو بٹھایا اور دوسری کرسی پر اپنے معذور بیٹے کو۔ پورا خاندان انتظار کر رہا تھا کہ کب ٹرک آئے اور وہ محفوظ جگہ پر منتقل ہو جائیں۔ مگر ایسا کچھ نہیں ہوا۔

اچانک جیلر، چھ سات سپاہیوں کے ساتھ اندر آیا۔ ایک کاغذ کھولا۔ زار اور اسکے پورے خاندان کے نام پڑھے اور بتایا کہ حکومت نے انہیں سزائے موت دیدی ہے۔ زار نے قطعاً یہ نہیں کہا کہ اس پر تو کوئی مقدمہ سرے سے چلایا ہی نہیں گیا۔ اسے تو کسی عدالت میں پیش ہی نہیں کیا گیا۔ یہ سراسر ناانصافی ہے۔ زار مکمل وقار سے خاموش کھڑا رہا۔ اسے پانچ گولیاں ماری گئیں۔ مرتے وقت بھی اس نے کرسی کا سہارا نہیں لیا۔ زخموں سے چور ہونے کے باوجود سیدھا کھڑا رہا۔ زمین پر اس وقت گرا جب روح پرواز کر چکی تھی۔ بالکل یہی رویہ، اسکی بیوی، بیٹے اور چاروں بیٹیوں کا تھا۔ انہوں نے انتہائی تہذیب اور بہادری سے موت کو قبول کیا۔ کوئی شور و غوغہ نہیں مچایا۔ قطعاً یہ نہیں کہا کہ انکے خلاف سازش ہو رہی ہے۔ وہ بے قصور ہیں۔ گزارشات پیش کرنے کا مقصد صرف ایک ہے کہ اچھے اور برے انجام سے بے نیاز، حکمرانوں میں ذاتی گریس (Grace) ہونی چاہیے۔ اقتدار کے دوران اگر انکی زبان سے نکلا ہوا ہر لفظ، ہزاروں یا لاکھوں نہیں، کروڑوں لوگوں کا نصیب بن جاتا ہے۔ تو مشکل وقت میں بھی انہیں اسی وقار کا مظاہرہ کرنا چاہیے جو وہ اقتدار میں کرتے آئے ہیں۔ یہ ذاتی کردار کی بلندی کی نشانی ہوتی ہے۔ صحیح اور غلط کی بات نہیں کر رہا۔ کیونکہ ہر حکمران کے کارناموں اور ناکامیوں کا فیصلہ صرف اور صرف تاریخ کرتی ہے۔ عرض کرنے کا قطعاً یہ مقصد نہیں کہ بادشاہت ایک اچھا نظام ہے۔ یا جمہوریت کو ختم ہو جانا چاہیے۔ ہرگز نہیں۔ بالکل نہیں۔ موجودہ دور میں جمہوریت واحد نظام ہے جسکے ذریعے حکومت کی جا سکتی ہے۔ مرکزی نکتہ صرف ایک ہے کہ حکمران طبقہ، حکمرانی کے عہد کے بعد، کس وقار اور تہذیب سے مسائل کا سامنا کرتا ہے۔ کس وضعداری سے مشکل ترین حالات میں اپنے آپکو قائم رکھتا ہے۔ دراصل، مصائب ہی وہ درسگاہ ہے جہاں انسانوں کے اصل کردار کا پتہ چلتا ہے۔ اس میں عام آدمی بھی شامل ہے اور بادشاہ یعنی حکمران بھی۔ اس میں عام سطح کے خاندان بھی شامل ہیں اور شاہی خاندان بھی۔ شائد میری بات تلخ لگے۔ شائد آپکے ذہن میں یہ بات اُبھرے کہ اگلی کہنے والی بات، مجھے نہیں لکھنی چاہیے تھی۔ مگر بہت سے المیوں کے درمیان ہمارا المیہ یہ بھی ہے کہ نہ مصیبت کے وقت ہمارے نام نہاد شاہی خاندان اور حکمران کوئی وقار دکھاتے تھے نہ ہی عوامی سطح پر اسکا مظاہرہ کیا جاتا ہے۔ ہمارا حکمران طبقہ مصائب کے سامنے پگھل کر موم بن جاتا ہے۔ عام لوگوں کی بات کرنے کا تو سوال پیدا ہی نہیں ہوتا۔ وہ تو پیدا ہی ذلیل ہونے کے لئے ہوئے ہیں۔

دعوے سے عرض کر سکتا ہوں کہ نکولس دوم کے پاس جتنی مال و دولت تھی۔ پاکستان کے جمہوری خاندانوں کے پاس اس سے زیادہ دولت ہو۔ زار کو تو پھر بھی اپنے خزانے کے متعلق معلوم تھا۔ ہمارے حکمران خاندانوں کو تو اپنے بین الاقوامی اثاثوں اور منافع کا علم ہی نہیں ہے۔ یہ اس قدر بہتات میں ہیں کہ انسانی عقل دنگ رہ جاتی ہے۔ قوم کو تو صرف لندن یا یو کے میں ان لوگوں کے اثاثوں کا ہلکا سا علم ہے۔ مگر انکی جائیداد تو دنیا کے تمام براعظموں میں پھیلی ہوئی ہے۔ پیرس سے لیکر نیویارک اور آسٹریلیا سے لیکر سپین، ہر جگہ ان لوگوں کے

محلات، گالف کورس، ہوٹل اور دیگر جائیدادیں موجود ہیں۔ اگر راست طریقہ سے دیکھا جائے تو زار تو ہمارے جمہوری بادشاہوں سے کافی غریب تھا۔ مگر زار اور ان میں ایک بہت بڑا فرق تھا اور ہے۔ زار کو مشکل ترین حالات میں باوقار رہنے کا نایاب فن آتا تھا۔ پاکستان کے جمہوری بادشاہوں کو پیسہ بنانا تو آتا ہے۔ مگر انکے اندر تہذیب، وقار اور مشکل وقت میں آب وتاب سے رہنے کا کوئی جزو موجود نہیں ہے۔ یہ اندر سے اس قدر کمزور اور بکھرے ہوئے لوگ ہیں کہ تعجب ہوتا ہے کہ صرف چند ماہ اقتدار سے باہر رہنے سے ہی انکے چہرے، رنگ ڈھنگ اور بول چال تک تبدیل ہو چکی ہے۔

اپنے دورِ حکومت میں انکے ملازم کھانا لانے کیلئے سرکاری ہیلی کاپٹر اور جیٹ استعمال کرتے تھے۔ نوکروں کی بات کر رہا ہوں۔ دوران حکومت، پاکستان کی مشہور ترین بیوٹیشن، سرکاری جہاز میں اسلام آباد، کراچی اور دیگر شہروں سے بلوائی جاتی تھی تا کہ شاہی خاندان کی خواتین کا بہترین میک اَپ کیا جا سکے۔ قوم سے سادگی کی اپیل کر کے، یہ لوگ، دنیا کی قیمتی ترین گاڑیاں جمع کرتے تھے۔ قومی ٹیکس کے پیسوں سے، بلکہ اُدھار کے پیسوں سے پانچ سے بارہ کروڑ کی قیمتی گاڑیوں میں سفر کرتے تھے۔ انکے مصاحبین، انہی کے نقشِ قدم پر چلتے تھے۔ لازم ہے کہ اگر بادشاہ قومی خزانہ کو شیر مادر سمجھے گا تو درباری تو ہر چیز لوٹ لینگے۔ بعینہ یہی ہوا۔ ملک پر قیامت برپا کر دی گئی۔ مگر انتہائی عجیب بات یہ ہے کہ ان خاندانوں کو تھوڑی سی گرم ہوا لگی ہے اور انہوں نے زار و قطار رونا شروع کر دیا ہے۔ شکوہ کے علاوہ انکی زبان پر کوئی دوسرا لفظ ہے ہی نہیں۔ جیل میں انہیں وہ تمام سہولیات فراہم کی گئی ہیں جو پاکستان کے ننانوے فیصد لوگوں کو میسر نہیں۔ حد تو یہ ہے کہ یہ سہولیات، جیل کے قوانین کے بھی خلاف ہیں۔ مگر گریہ اس قدر کیا جا رہا ہے کہ شائد جیل میں انہیں اذیت ناک ماحول میں رکھا گیا ہے۔ کیا پاکستان کے قیدیوں کو ائیر کنڈیشنر کی سہولت موجود ہے۔ ہرگز نہیں۔ بالکل نہیں۔ مگر انکے پاس جیل میں ائیر کنڈیشنر موجود ہیں، ڈاکٹروں کی فوج انکی صحت کا خیال رکھنے کیلئے چوبیس گھنٹے موجود ہے۔ ذاتی خدام اندر موجود ہیں۔ مگر اسکے بالکل برعکس یہ شاہی لوگ بہت سخت ناراض ہیں۔ یہ ہرگز ہرگز اپنے کیے پر، اپنی لوٹ مار پر نادم نہیں ہیں۔ اعلانیہ کہتے ہیں کہ ہم ایماندار ہیں۔ ہم بے قصور ہیں۔ ہم نے کوئی غلط کام نہیں کیا۔ یہ لوگوں کے سامنے جمہوریت کی بات کرتے ہیں اور تنہائی میں ریاستی اداروں کے پیر پکڑ لیتے ہیں۔ یہ کیمرہ کے سامنے وکٹری کا نشان بناتے ہیں مگر درون خانہ، دوسروں ملکوں کے ذریعے اپنی آزادی کا پروانہ حاصل کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ یہ عام لوگوں میں اپنی ایمانداری کا ڈھنڈورا پیٹتے ہیں۔ مگر چھپ کر مقتدر حلقوں کو گزارش کرتے ہیں کہ اربوں ڈالر واپس کرنے کیلئے تیار ہیں۔ بس شرط یہ کہ ہمارا نام کہیں نہ آئے۔ مشرقِ وسطیٰ کے کسی بادشاہ کے حوالے کر دیتے ہیں اور وہ پاکستان منتقل کر دیگا۔ مگر یقین فرمایئے۔ کہ ملکی اور بین الاقوامی سطح پر کوئی مقتدر حلقہ انکی باتوں پر یقین کرنے کیلئے تیار نہیں۔ قول و فعل کے تضاد نے انہیں بالکل تنہا کر دیا ہے۔ ہر جگہ سے مایوس ہو کر، اب یہ صرف اور صرف الزام تراشوں اور شور شرابے کی طرف مائل ہو چکے ہیں۔ نہ انہیں باوقار طریقے سے زندہ رہنا آتا ہے۔ اور نہ ہی نکولس کی طرح تہذیب سے مصیبت کا سامنا کرنا آتا ہے۔ تاریخ انہیں کس نام سے یاد کریگی، یہ کچھ دہائیوں بعد سامنے آ جائیگا۔ یا شائد، تاریخ انہیں اس قابل ہی نہ سمجھے کہ یاد رکھا جائے!

راؤ منظر حیات